پاکستانی ناول کی تخلیقی جہات

غفور شاہ قاسم

ABSTRACT:

The sentiments particular to Pakistani society and the different linguistic features of the Pakistani version of Urdu language are very evident in Urdu Novels written over here after independence. This article is based on the seventy one years long history of Pakistani Novels. Different aspects and dimensions of Pakistani Novels are discussed in the article. Pakistani Novels have depicted our political and social milieu for the last seventy one years. In short, Pakistani Novels are a true reflection of our society.

Key words: Takhliqi Jihat, Jangloos, Hijrat, Qoumi Aashob, Odipis Complex, Flashback Technique

ناول عہد جدید کی ایسی تخلیق ہے جس میں اظہار کے جتنے زیادہ امکانات ہیں نثری ادب کی کسی دوسری صنف میں نہیں ہیں۔ ناول جزو میں کل اور کُل میں جزو کا منظر نامہ پیش کرنے کا عمل ہے۔ بہ قول محمد حسن عسکری ''ناول زندگی کی تفتیش، اس کی معنویت کی تلاش اور حیات و کائنات کی تعبیر و تفسیر ہے۔'' جس طرح کوئی غیر معمولی سائنسی ایجاد معاشرتی زندگی کے سابقہ نظام کو بدل کے رکھ دیتی ہے اور انسانی رویوں کو نئی شکل دے دیتی ہے۔ اسی طرح فکری اور فنی حوالوں سے مکمل ناول انسانی رویوں اور روابط کے نئے امکانات کی کہانی سناتا ہے۔ جو محض تصوراتی اور فلسفیانہ نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق معاشرے کے زندہ حقائق سے ہوتا ہے۔

پاکستان میں اردو ناول کی تخلیقی جہات کا احاطہ اکہتر برسوں پر پھیلا ایک ایسا ہمہ گیر موضوع ہے جسے چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں ہے تاہم ہم نے مختصر مگر جامع انداز میں اس موضوع کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو ناول کے مزاج شناس ناقد ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے بجا طور پر لکھا ہے:

''پاکستانی ناول نے موضوع ، ہیئت ، اسلوب ، تکنیک اور کردار نگاری کے حوالے سے بہت سے سنگ میل عبور کر لیے ہیں ۔ ہمارے روایتی ادبی ناولوں کے اسالیب ،موضوعات اور مخصوص نقطہ ہائے نظر جہاں ہیئت کے حامل ہیں وہیں جدید اور مابعد جدید ناولوں کی ہیئت ، اسالیب ، تکنیکوں ، زبان و بیان رُجحانات اور وژن کو بہت زیر بحث لایا جانا چاہیے کیونکہ ہمارا ناول جدید یت سے اب مابعدِ جدید کے منطقے میں داخل ہو چکا ہے ۔'' [۱]

قیام پاکستان سے قبل عزیز احمد ،احسن فاروقی اور قرۃ العین حیدر ناول لکھ رہے تھے ۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ قیام پاکستان کے فوری بعد سب سے قابل توجہ ناول عزیز احمد نے لکھے ۔ یہ ناول ہیں: ایسی بلندی ایسی پستی ، گریز اور شبنم،ایسی بلندی ایسی پستی ان کی ناول نگاری کا نقطۂ کمال ہے بلاشبہ وہ ایک کثیر المطالعہ باشعور ناول نگار تھے نفسیاتی حقیقت نگاری کے حوالے سے وہ بالخصوص ناول نگاری میں ممتاز مقام کے حامل ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناول کا ایک بڑا رجحان ہجرت اور فسادات کا موضوع ہے ۔ اس نوعیت کے ناولوں میں رئیس احمد جعفری کا مجاہد نسیم حجازی کا خاك و خون ایم اسلم کا رقص ابلیس ' اور قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ یا خدا ہے ۔

1950ء سے اب تک صنف ناول کے حوالے سے ہمارے ہاں جو سب سے بڑی ناول نگار شخصیت سامنے آئی ہیں وہ قرۃ العین حیدر ہیں ۔ ابتدائی تین دہائیوں تک بہت سے ناول براہِ راست قرۃ العین حیدر کے زیر اثر اور کئی ناول اس فکری رجحان کی تردید یا ردِعمل میں لکھے گئے ۔ قرۃ العین حیدر کا سب سے بڑا کمال مسلسل ہمہ جہتی وحدتِ نمو ہے جو اُن کی پہلی تحریر سے لے کر وفات تک لکھی جانے والی آخری تحریر تک برقرار ہی ۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا ناول آگ کا دریا اشاعت پذیر ہوا یہ اردو ادب میں پہلا بڑا تخلیقی تجربہ ہے ۔ یہ ناول بڑے کینوس کا ناول ہے ۔ جو گزشتہ چار ہزار سال کی تہذیبی ، سیاسی ، تاریخی اور معاشرتی زندگی کی عہد بہ عہد ابھرنے والی تبدیلیوں سے گزرتا ہوا عہد جدید تک آتا ہے ۔ احسن فاروقی کا ادبی کارنامہ ان کا ناول سنگم ہے ۔ اس ناول میں انھوں نے برصغیر کی تاریخ کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے ۔ احسن فاروقی کے بعد پاکستان کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام شوکت صدیقی کا ہے ان کا پہلا ناول خدا کی بستی ہے جس میں تقسیم برصغیر کے بعد تشکیل پذیر شہری معاشرے کے باطنی حقائق کو جرات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ ان کا دوسرا ناول جانگلوس ہے ۔ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جانگلوس' ایک ایسا ناول ہے جو نہ صرف قیام پاکستان ، اس کی تاریخ ، مسایل اور پاکستانیت کے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ اس کے جغرافیے ،شہروں دیہاتوں ،گلیوں ، سڑکوں اور نہروں کے ساتھ ساتھ چاروں صوبوں میں سفر کرتی مختلف ثقافتوں ، رسموں رواجوں سے بھی روشناس کراتا چلا جاتا ہے ۔ اگر اس ناول کا تجزیہ کیا جائے تو پاکستان میں لکھی جانے والی اردو کے خدوخال واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

جانگلوس میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوک گیتوں، ماہیوں، دوہڑوں، ناچوں، سمیوں کے منظروں کو بھی نہایت خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی تینوں جلدوں میں پاکستانی لینڈ اسکیپ کی مثالیں جابجا بکھری پڑی ہیں۔ ناول میں اردو پنجابی سرائیکی، سندھی کے علاوہ کسی حد تک پشتو اور بلوچی کے الفاظ بھی برمحل استعمال کیے گئے ہیں۔ پاکستانی اردو کی زیادہ مثالیں کرداروں کے ایسے مکالمات ہیں جن میں مقامی کردار اس لہجے میں اردو بولتے ہیں جیسا کہ ناول نگار چاہتا ہے کہ وہ ایسے بولیں۔ جانگلوس پاکستانی اردو کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ خالصاً پاکستانی ثقافت اور معاشرت کا ترجمان ناول ہے۔ یہی اس کی انفرادیت اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

خدیجہ مستور کا ناول آنگن پاکستانی ادب کا عکاس ہے اسے قارئینِ ادب کی طرف سے بڑی پذیرائی ملی اور ناول کے نقادوں نے بھی اس ناول کو دل کھول کر داد دی۔ آنگن کی قابلِ ذکر خوبی کہانی کی بُنت، کردار نگاری اور اختتامیہ ہے۔ بحیثیت مجموعی آنگن پاکستانی ادب کے چند منتخب ناولوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ زمین اس ناول کی توسیع ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا شاہکار ناول دشتِ سوس ایک اہم ادبی دستاویز ہے۔ اسلوب نگارش کے حوالے سے یہ ایک بے مثال تخلیقی کام ہے۔ اس میں منصور بن حلاج کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول میں متعلقہ دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی کوائف کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا۔ نثار عزیز بٹ کا ناول نے چراغے نے گلے بہت اہم تخلیق ہے مگر یہ ایک Underrated ناول ہے۔ اس ناول میں پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کو Touch کیا گیا ہے۔

عبداللہ حسین پاکستان کے اُن ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اداس نسلیں اور نادار لوگ لکھ کر پاکستانی ناول کی تاریخ میں اپنا ممتاز مقام متعین کرایا ہے۔ ان کا دوسرا ناول پہلے ناول کا تسلسل ہے۔ یہ ناول پاکستانی معاشرے کے مزاج پر بھر پور تبصرہ ہے۔ ان کا ایک مختصر ناول قید اپنے حیرت انگیز قصے کی بنیاد پر قابل ذکر ہے۔ اس ناول پر جتنی بات ہونی چاہیے تھی اب تک نہیں ہوئی لیکن اس کا موضوع بڑا Unique ہے۔ ناول کے ماجرے میں گاؤں میں پیری مریدی کے مستحکم ادارے کو بے رحمانہ حقیقت نگاری کے ساتھ آشکار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے معززین ممبران اسمبلی اور فوجی عہدے دار پیروں کے اندھے معتقد ہیں۔ اس ناول پر تفصیل سے تنقیدی گفتگو ہونا چاہیے۔

انتظار حسین کی تخلیقی واردات کا مرکزی نقطہ ہجرت اور اس کے اثرات ہیں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی ہجرت رونما ہوئی۔ پاکستانی ناول نے معاصر تاریخ کے اس غیر معمولی واقعے کی بھر پور نمائندگی کی ہے۔ قرۃ العین حیدر عبداللہ حسین اور انتظار حسین نے بالخصوص وسیع پیمانے پر ہونے والی اس ہجرت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ جہاں تک انتظار حسین کا تعلق ہے۔ اُن کے حوالے سے جواں مرگ ناقد سراج مُنیر نے اس رائے کا اظہار کیا ہے:

> ''انتظار حسن کے سلسلے میں یہ بات ہمیں ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ اُن کے ہاں ہجرت محض اکیلا واقعہ نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے تجربے کی سی ہے جو زاویۂ نگار فراہم کرتا ہے۔

واقعات کے ایسے سلسلے کو دیکھنے کا جو واقعۂ کربلا سے سنہ ستاون تک اور سنہ ستاون سے سنہ اکہتر تک قائم ہیں اور ہر واقعہ فی الاصل ایک پوری قوم کے سفر کے معنی یا اس کی بے معنویت کا تعین کرتا ہے''۔[۲]

انتظار حسین کے ناول بستی، تذکرہ اور آگے سمندر ہے فنی اور ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے زیادہ وقیع ہیں۔ یہ تینوں ناول فن پر اُن کی مکمل گرفت کے عکاس ہیں۔ تینوں ناولوں میں کسی نہ کسی قومی آشوب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان تینوں میں ہمارے نزدیک ''بستی'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انتظار حسین کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ ناول کلیدی مقام کا حامل ہے۔ اس ناول کا ایک موضوع تو اپنی زمین سے بچھڑنے اور اپنی تہذیب و ثقافت کے نابود ہونے کا کرب ہے تاہم پاکستان کے حالات و مسایل بھی اس کا موضوع بنتے ہیں۔ جسے انتظار حسین کے داستانوی اسلوب نے مزید کرب انگیز بنا دیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ ناول انتظار حسین کی عالمی سطح پر پہچان کا بڑا حوالہ ہے اور اب تو اس کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جس کی وجہ سے اس کے قارئین کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ ڈاکٹر انور سجاد نے اس ناول کو بنیاد بنا کر انتظار حسین پر ایک طویل تجزیہ قلم بند کیا ہے اور اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

''بستی میں ماسٹر فکشن رائیٹر اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ یہ اس کے فکشن کی سمیٹ ہے اب اگر اُستادِ فن کو اپنا سفر جاری رکھنا ہے تو اُسے یہ دائرہ توڑنا ہوگا۔[۳]

مختصر یہ کہ انتظار حسین کی شخصیت اور سرگذشت تک رسائی کے لیے اس سے بہتر ان کی کوئی تخلیق نہیں ہے۔ انھوں نے اس ناول کے ذریعے اردو فکشن کی دنیا کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرایا ہے۔

انتظار حسین کا ناول آگے سمندر ہے کراچی کی موجودہ صورتِ حال کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں انتظار حسین کراچی کے لوگوں کو بالخصوص اور پاکستان کے لوگوں کو بالعموم یہ بتاتے نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اپنا وجود بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس ملک کی بقا کو یقینی بنانا ہوگا۔ انھوں نے اس ناول میں کراچی میں مقیم ہونے والوں کے کچھ خاص متعصّبانہ رویوں پر لطیف طنز کے نشتر برسائے ہیں اور ہجرت کے مسئلے کی بساط یہ کہہ کر لپیٹ دی ہے کہ ''ایک وقت کشتیاں جلانے کا ہوتا ہے اور ایک وقت کشتیاں بنانے کا ہوتا ہے۔ اب بھرتا ہوا سمندر ہمارے پیچھے نہیں بلکہ ہمارے اندر ہے اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنانی ہے۔''[۴]

اردو ناول کے ممتاز نقاد ڈاکٹر ممتاز احمد خان کہتے ہیں:

''یہ خیال یا وژن سُنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اتفاق سے اس ناول پر زیادہ بحث و مباحثہ نہیں ہوا ہے کہ جس کی اشد ضرورت ہے تاکہ مزید جہات سامنے آ سکیں''۔[۵]

بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ کا مرکزی خیال منفرد اچھوتا اور طبع زاد ہے۔ اس ناول کا مرکزی موضوع رزقِ حرام کے انسانی نفسیات اور روح پر مرتب ہونے والے اثرات ہیں۔ ناول صیغہ واحد متکلم میں لکھا گیا ہے یعنی ناول کا مرکزی کردار قیوم ہے جس کی زندگی میں سیمی شاہ، عابدہ امتل اور روشن وغیرہ نسوانی کردار ہیں جو اس کے

گدھ روپ کو آشکار کرتے ہیں ۔ ناول نگار نے پروفیسر سہیل کی گفتگو میں اپنا نظریہ ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

> ''مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی Genes کو متاثر کرتا ہے ۔ رزقِ حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے ۔ رزق حرام سے جو Genes تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لُولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ نا امید بھی ہوتے ہیں ۔ یہ Genes جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان Genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں منِ حیث القوم رزق حرام کھانے کا چسکا پڑجاتا ہے وہ منِ حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہے''۔[۶]

ڈاکٹر انور سدید نے اس ناول پر اپنی وقیع رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''بانو قدسیہ کے ارتقائے فن میں ان کے ناول راجہ گدھ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک کثیر الجہت ناول ہے جس کی معنویت مادی اور روحانی سطح پر ظاہر ہوتی ہے اور اس میں فلسفے کے داخلی سوالات کے ساتھ ساتھ سائنسی انکشافات سے استفادے کا رجحان بھی نمایاں نظر آتا ہے ۔ سماجی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ کیفیتوں کا منظر نامہ سامنے آتا ہے تو انسانی سوچ تحیر میں ڈوب جاتی ہے ۔ ناول کا واقعاتی بیانیہ اتنا پُر لطف اور لذت آگیں ہے کہ یہ انسان شناسی کسی حد تک پس منظر میں چلی جاتی ہے اور روحانیت کا زاویہ فوقیت حاصل کر لیتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ راجہ گدھ اردو ادب کا ایک منفرد اور بے حد اہم ناول ہے جس کی تخلیق میں بانو قدسیہ کا مختلف علوم کا گہرا مطالعہ شامل ہے۔''[۷]

رحیم گل کا ناول جنت کی تلاش ایک غیر معمولی تجربہ ہے جس میں حیات و کائنات کے بنیادی موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں ۔ یہ اردو ادب کا پہلا ناول ہے جس میں گہری اور پیچیدہ اُلجھنیں موضوع بنی ہیں جنھوں نے صدیوں سے بڑے بڑے حکیموں، داناؤں اور دانش وروں کو جستجوئے مسلسل میں مبتلا کر رکھا ہے ۔

ممتاز مفتی کا ناول علی پور کا ایلی ساٹھ کی دہائی میں چھپا۔ یہ خود سوانحی ناول ہے ۔ تخیل اور حقیقت کے امتزاج اور جنسی نفسیات کے خاص پہلوؤں کی بنا پر یہ ناول ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ناول کے مرکزی کردار ایلی (خود ممتاز مفتی) کو نمایاں کرنے کے لیے ناول نگار نے کسی حد تک داستان کی تکنیک استعمال کی ہے ۔ اس ناول کا دوسرا اہم کردار شہزاد ہے۔ اس نسوانی کردار کی شخصیت کو دلکش بنانے کے لیے مصنف نے اس قدر محنت کی ہے کہ کردار میں کچھ ماورائیت سی آ گئی ہے ۔ اس ناول کا دوسرا حصہ الکھ نگری کے نام سے شائع ہوا اس حصے پر یادداشت نگاری کا رنگ غالب ہے ۔ سو ہم اسے بہ مشکل ناول قرار دے سکتے ہیں ۔

الطاف فاطمہ کا ناول دستک نہ دو (جو کرداری تضادات کو سامنے لاتا ہے) اورمشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے سیاسی معاشرتی اور سماجی حالات پر مبنی ناول چلتا مسافر دونوں ان کی ادبی شناخت ہیں۔رضیہ فصیح احمد کا ناول صدیوں کی زنجیر سلمٰی اعوان کا تنہا طارق محمود کا ناول اللہ میگھ دے اور مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ بھی سقوطِ ڈھاکا کے پس منظر میں لکھے گئے نہایت اہم اور قابلِ مطالعہ ناول ہیں۔انھی سطور میں اب ہم مستنصر حسین تارڑ کی ناول نگاری کا جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔انھوں نے اردو سفر نامہ نگاری میں ممتاز مقام حاصل کرنے کے بعد ناول نگاری کی طرف رجوع کیا تو گویا اپنے آپ کو شکست دے دی۔اب سفر نامہ نگاری سے زیادہ اردو اب میں ان کا نام ناول نگاری میں معتبر حوالہ بن چکا ہے۔ڈاکٹر خالد اشرف نے اپنی کتاب برصغیر میں اردو ناول میں مستنصر حسین تارڑ کی ناول نگاری کے بارے میں رائے دی ہے کہ''اب جب کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں آخرِ شب کے ہم سفر کے بعد توانا تخلیقی تجربوں کے امکانات مِٹ چکے ہیں۔آج نظریں پاکستان بالخصوص لاہور کی جانب اُٹھتی ہیں جہاں تارڑ نے''بہاؤ جیسا ناول لکھ کر اردو میں یکسر منفرد اور روایت شکن اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے''۔

ناول بہاؤ، تکنیکی اور اسلوبیاتی انفرادیت کا حامل ہے اس ناول کا تعلق جڑوں کی تلاش سے ہے۔ بہاؤ میں شعور کی رو کی ایسی تجسیم ہے جس میں صدیاں لمحوں اور لمحے صدیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔اس ناول کا کینوس تہذیب انسانی ہے۔تارڑ کے ناول راکھ کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔تاہم اس پر کچھ مزید لکھنے کی ضرورت ہے ان کا یہ شاہکار ناول یعنی راکھ آپ بیتی بھی ہے وطن بیتی بھی۔ملکِ عزیز کی نصف صدی کی تاریخ کو ناول کا روپ دے دیا گیا ہے۔یوں یہ ہماری اپنی کہانی ہے۔پاکستان کی کہانی، ٹوٹتے بکھرتے خوابوں کی کہانی ہے، شکست وریخت سے دو چار اداروں کی کہانی ہے۔یہ ناول قیام پاکستان کے بعد کی نصف صدی کی تاریخی دستاویز ہے۔ناول نگار نے سیاست دانوں کی چال بازیوں اور عیاریوں کی وہ تصویریں دکھائی ہیں کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے لفظ سیاست اور سیاست دان سے نفرت ہو جاتی ہے۔یہ ناول منظر نگاری، مکالمہ نویسی اور ماحول آفرینی کا کمال ہے۔ناول کا آغاز غیر روایتی وسط روایتی اور اختتام المیاتی قنوطی اور بسیط ہے۔ناول نگار نے ماضی جاری کے لیے ماضی استمراری کا صیغہ استعمال کیا ہے بلکہ اس کے لیے بہترین اصطلاح ماضی مستقل استمراری ہے۔

تارڑ کے کچھ ناولوں کا مزید ذکر نئی صدی یعنی اکیسویں صدی کے ناولوں کی ذیل میں اس تحریر کی آخری سطور میں آئے گا۔پنجاب کے دیہی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں سید شبیر حسین کا جھوک سیال غلام الثقلین نقوی کا میرا گائوں قابلِ مطالعہ ناول ہیں۔جھوک سیال قیام پاکستان کے بعد دیہی زندگی کے پس منظر میں لکھا جانے والا نہایت عمدہ ناول ہے۔جس کا نام پاکستان کے اردو ناول کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔جہاں تک میرا گاؤں کا تعلق ہے یہ پورے پاکستان کے دیہاتوں کی کہانی ہے جہاں جاگیر دارانہ نظام کی جڑیں گہرائی تک پیوست ہیں۔ناول کی کہانی قیامِ پاکستان کے وقت سے شروع ہو کر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ تک ختم ہوتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کا ناول ترنگ بھی دیہات کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک انوکھا اور منفرد ناول ہے ۔ نشے کے عادی لوگوں کے بارے اردو میں یہ پہلی تخلیقی کاوش ہے ۔موضوع کا گہرا مطالعہ اور اس لت میں مبتلا لوگوں کا باریک مشاہدہ ناول کی بنیاد ہے ۔ ناول میں پوری دیہی زندگی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے ۔ یہ ناول ایک سماجی دستاویز ہے اور پاکستانی دیہی معاشرت کو سمجھنے کی کلید ۔

محمد خالد اختر کا ناول چاکیواڑہ میں وصال اور نشاط فاطمہ کا آنسو جو بہہ نہ سکے تادیر زندہ رہنے والی اور سدا بہار تخلیقات ہیں ۔ جو ہمارے افسانوی ادب کا وقار ہیں ۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک پیراگراف میں پاکستان کے اُن ناول نگاروں کا تذکرہ ناگزیر ہے جنھیں ہماری ادبی دنیا نے نظر انداز کر دیا اور ہمارے نقادوں نے ان کے تخلیقی کام پر بالکل توجہ نہیں دی۔

مظفر اقبال کے دو ناول انخلاع اور انقطاع پاکستان کی سماجی سیاسی صورتِ حال کے آئینہ دار ہیں۔ انخلاع کئی سطحوں کا ناول ہے پہلی سطح پر یہ پاکستانی معاشرے کی تاریخی صورت حال کو پیش کرتا ہے جو ساٹھ کی دہائی کے اواخر سے ستر کی دہائی کے آخر سالوں تک بن اور بگڑ رہی تھی ۔ دوسری سطح پر یہ ناول تخلیقی ذہن اور معاشرے کے رشتے کی گرہ کشائی کرتا ہے ۔تکنیکی طور پر یہ ایک منفرد ناول ہے ۔ بہ قول ناصر عباس نیر انخلاع اپنے موضوع کے پھیلاؤ، اپروچ کی گہرائی اور نکتہ نظر کی اصالت کے اعتبار سے اردو کا ایک اہم ناول ہے ۔ تاہم ان کا دوسرا ناول انقطاع انخلاع کی توسیع ہے ۔ ریاض جاوید عزیز احمد کی سطح کے ناول نگار تھے مگر یہ ایک بدقسمت ناول نگار ہیں جس کی جانب ہمارے نقادوں کی توجہ نہیں جا سکی ۔ اُن کے تین ناول لہو رسنے کے بعد ،زخم کھلنے کے بعد اور اجنبی آنے کے بعد شائع ہوئے اور یہ تینوں بہترین ناول ہیں ۔ان میں مطالعاتی دلچسپی بھی ہے اور تجسس بھی اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی معنویت کی تلاش بھی ۔ ارشد چہال کے ناول دُھندے کوس میں پاکستان کی علاقائی ثقافت کے تناظر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے رویوں کا نفسیاتی ردعمل پیش کیا گیا ہے ۔انسانی تعلقات کے مابین حائل طبقاتی جبریت اس ناول کا مرکزی خیال ہے ۔ ارشد چہال کی یہ تخلیقی کاوش جتنی پذیرائی کی حق دار تھی وہ انھیں نہ مل سکی ۔

اکرام اللہ کا ناولٹ گرگِ شب ہے جس میں موضوعی تجربات کو اہمیت دی گئی ہے ۔ گرگِ شب، میں موضوع یا تھیم کے اعتبار سے ایک تجربہ کیا گیا ہے۔ جس کا تعلق اوڈی ڈی پس کمپلیکس (Odepus Complex) جیسے نفسیاتی اور جنسی رویے سے ہے جس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں سے جنسی تعلق کہ جن سے اس نوعیت کے تعلق کو حرام قرار دیا گیا ہے ۔اس ناولٹ میں پیش کیے بعض مناظر محض تلذذ ابھارنے کے لیے ہیں اور یہ سفلی جذبات کو بھڑکاتے ہیں ۔ اگر ناول نگار ان باتوں کو علامتی انداز سے بیان کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا ۔ تاہم اپنے مخصوص موضوع اور تھیم کے حوالے سے پاکستانی ناولوں میں ''گرگِ شب'' کا خصوصی حوالہ ضروری ہے۔

ہمارے وہ پاپولر ناول نگار جنھیں پڑھنے والوں کا وسیع حلقہ میسر رہا اُن میں نسیم حجازی ، ابن صفی ، رضیہ بٹ ، عمیرہ احمد اور ہاشم ندیم شامل ہیں ۔ مطالعاتی عادات کو فروغ دینے میں ان ناول نگاروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں

کیا سکتا۔

۲۰۰۶ء اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سال دو اہم ترین ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی) اور غلام باغ (مرزا اطہر بیگ) اردو فکشن کے اُفق پر طلوع ہوئے۔ مرزا اطہر بیگ کا لکھا ناول غلام باغ ۳۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ناول ایک نئے اسلوب اور توانا موضوع کو پیش کرتا ہے۔ فلسفیانہ پس منظر کا حامل یہ پاکستانی ناول عام انسانوں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ ناول کا نام غلام باغ استعاراتی اہمیت رکھتا ہے۔ غلام اور باغ دونوں لفظ اکھٹے مل کر اس کی استعاراتی اہمیت کو دو چند کر دیتے ہیں۔ غلام باغ کا ایک بڑا موضوع انسان کی انسان پر، قوموں کی قوموں پر اور نسلوں کی نسلوں پر غلبہ پانے کی خواہش ہے۔ دیوانگی غلام باغ کے بنیادی موضوعات میں سے ایک ہے ناول نگار کے خیال میں دیوانگی اور فرزانگی میں بال برابر فرق ہوا کرتا ہے۔ دیوانگی اگر ایک طرف ایک پاگل پن کا نام ہے تو دوسری طرف یہ ایک جنون اپنے مقصد سے ایک حد سے بڑھے ہوئے جذبات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

غلام باغ اپنے موضوع، اسلوب، ہیئت اور کردار نگاری سبھی حوالوں سے ایک منفرد ناول ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں ایک نئی اور توانا نثر بھی پیش کی گئی ہے۔ جو طول طویل جملوں کی حامل ہے لیکن اس کے باوجود گفتگو کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ سب سے بڑھ کر اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اردو کے افسانوی ادب میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بہ قول:

> ''مرزا اطہر بیگ نے غلام باغ کی شکل میں ناول آف دی ایبسرڈ کا ہمارے ہاں ایسا تجربہ کیا ہے جسے بھلایا نہیں جا سکے گا۔ اس لیے کہ ابتدا سے لے کر اختتام تک مضحکہ خیز و محیر العقول واقعات اور کسی دوسرے سیارے کے لوگوں کے مکالمات کی دل چسپ دروبست کو روایتی ہیئت سے بچتے ہوئے نئی اسلوبیاتی شکل دینا کہ جس میں معانی بھی برآمد ہوں اعلیٰ فن کار کی دلیل ہے۔''[۵]

اس ناول کی اشاعت سے ناول نگار مرزا اطہر بیگ پاکستانی ناول نگاروں کی اس قلیل فہرست میں شامل ہو گئے ہیں جنھوں نے پہلا ناول لکھ کر ہی افسانوی ادب میں اپنی ایک واضح حیثیت متعین کرا لی ہے۔ ناول کی سب سے منفرد بات ناول کا فلسفیانہ ہونے کے باوجود اپنے اندر مزاح کی چاشنی سمیٹے ہوئے ہے۔ مزاح کی یہ وہ قسم ہے جسے وہ (Comic Realism) کا نام دیتے ہیں۔ پاکستانی ناول میں اس ناول کی صورت میں موضوعات اور کرداری حوالے سے جو نئی پیش رفت ہوئی ہے امید ہے وہ نئے تخلیقی تجربات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

مرزا اطہر بیگ کا دوسرا قابلِ ذکر ناول صفر سے ایک تک ہے۔ یہ ناول ایک سائبر سپیس کے مُنشی کی سرگزشت کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ ناول اپنے عنوان کی جدت اور موضوع کی نُدرت کی وجہ سے اکیسویں صدی کے معلوماتی، تکنیکی تقاضوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ناول کا عنوان صفر سے ایک تک علامت ہے۔ ایک بائنری کوڈ کی جس کے تحت سارا کمپیوٹر نظام چلتا ہے۔ یہ ناول ان جدید مسایل کا احاطہ کرتا ہے جو سائنسی ایجادات بالخصوص

کمپیوٹر کی وجہ سے معاشرے میں فروغ پا رہے ہیں ۔ ناول انسان کی تنہائی اور داخلی کرب کو بھی موضوع بناتا ہے جو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور کا عطیہ ہیں۔ ایک طرف آج کا انسان پوری دنیا سے جڑا ہوا ہے، علم و معلومات کے تمام دروازے اس کی ایک کلک سے کھلتے ہیں اور دوسری طرف اسے یہ معلوم نہیں ہے اس کے ہمسائے کی بسر اوقات کیسے ہو رہی ہے ۔ ایک طرف دنیا سمٹ کر آفاقی گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے تو دوسری طرف انسان اپنی ذات کو سمجھنے سے قاصر ہوتا جا رہا ہے ۔

ناول نگار نے پہلی مرتبہ بھر پور انداز میں کمپیوٹر کی کہانی اور اس کے معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کو صفر سے ایک تک میں سمویا ہے ۔ کمپیوٹر گیمز سے پھیلنے والی شدت پسندی کے رجحانات بھی ناول کا ایک اہم موضوع ہیں ۔ زیرِ تبصرہ ناول میں ناول نگار نے جس انداز میں بالکل ایک نئے موضوع کو برتا ہے اس نے اردو فکشن میں ایک نیا دریچہ کھول دیا ہے ۔ بہ قول ایک نقاد :

> "The old master and slave game is set on the chess board of a New Millnnium."

اگرچہ یہ ناول اطہر بیگ کے پہلے ناول غلام باغ کی نسبت کینوس کے لحاظ سے محدود ہے اور اس ناول کے بوجھ تلے دب گیا ہے تاہم صفر سے ایک تک اپنے موضوع کی جدت اور اسلوب کے نئے تجربے کی بدولت اکیسویں صدی کے ناولوں میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ یہ ناول پاکستانی ناول کی تخلیقی جہت میں ایک اہم اضافہ ہے۔ پاکستان میں لکھے جانے والے جدید ناولوں میں مستنصر حسین تارڑ کے تین ناول خس و خاشاک زمانے، اے غزال شب اور منطق الطیر جدید ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ۔ خس و خاشاک زمانے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا کینوس ان کے ناول راکھ کی نسبت زمانی اور مکانی دونوں حوالوں سے زیادہ وسیع ہے ۔ یہ ناول ۱۹۳۰ء سے ۲۰۰۱ء تک کے زمانی عرصے کو محیط ہے ۔ یہ ناول کردار نگاری ، مکالمہ نویسی اور پلاٹ پر مضبوط گرفت کے حوالے سے غیر معمولی تخلیق ہے ۔ اس ناول کا کوئی ایک موضوع متعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر اچھے ناول کی طرح یہ بھی اپنے اندر زندگی کے سارے ہی رنگ اور ذائقے لیے ہوئے ہے اور اسے کسی ایک جگہ، ملک اور زمانے تک محدود نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کئی زمانے اور برصغیر پاک ہند اور دنیا کے بہت سے اہم واقعات وسانحات اور تاریخی حوالے ملتے ہیں تاہم آسانی کے لیے ہم اسے ایک سماجی ، سیاسی اور فکری ناول کہہ سکتے ہیں ۔ ناول کی کہانی واقعات کی بجائے کرداروں کے توسط سے آگے بڑھتی ہے ۔ ناول نگار جن کرداروں کا ان مٹ نقش قارئین کے ذہن پر ثبت کرنے میں کامیاب رہے ہیں ان کرداوں میں سرو سانسی ، بخت جہان ، امیر بخش ، لہنان سنگھ اور اچھو شیخ شامل ہیں ۔ ناول کے بے شمار نسوانی کرداروں میں نور ، امرت کور ، شباہت صاحباں ، مقدس بیگم اور ماہلو کی کردار نگاری بے مثال ہے ناول نگار نے ہر کردار کی عادات و اطوار ، خدو خال ، لب و لہجے اور اندازِ گفتگو کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ ہمیں کردار اپنے سامنے چلتا پھرتا اور اٹھتا بیٹھتا دکھائی دیتا ہے ۔ ناول میں تارڑ نے نہ صرف یہ کہ دیہی زندگی کے نشیب و فراز کو خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے بلکہ اس نے شہری معاشرت کی بھی نہایت عمدہ عکاسی کی

ہے۔ خس و خاشاک زمانے مصنف کی پسندیدہ فلیش بیک تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ طرزِ تحریر میں کہیں کہیں Boldness آ گئی ہے۔ زبان کی وسعت ، موت ، محبت اور جنس جیسے مصنف کے پسندیدہ موضوعات کی نئی Treatment سحرانگیز اور کیف آور نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ ناول مدتوں قارئینِ ادب کے ذہنوں میں زندہ رہے گا۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول غزالِ شب کا آغاز ن۔م راشد کے مجموعہ کلام لا=انسان کی ایک خوب صورت نظم سے ہوتا ہے جس کا عنوان ''اے غزالِ شب'' ہے ۔ ناول ناول نگار کی فنی وموضوعاتی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے جس میں روس کے مارکسی نظام کی شکست وریخت کا تجزیہ نہایت دانائی اور دل چسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ ناول کی کہانی اُن چار بنیادی کرداروں کے گرد گھومتی ہے جو پاکستان سے ترکِ وطن کر کے سُرخ سویرے کی تلاش میں مستقلاً روس اور ہنگری وغیرہ میں جا آباد ہوئے تھے۔ کمیونسٹ نظریات پر مبنی روسی سیاسی نظام نوے کی دہائی میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تو ان چار کرداروں کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ یہ چاروں کردار خوابوں کی راکھ پر بیٹھے اپنے ماضی کے مناظر کو مزاروں کی صورت تلاشتے ناول کی کہانی کو تحیر وتجسس آمیز فضا میں آگے بڑھاتے ہیں ۔ ناول نظریاتی پس منظر رکھتا ہے کہ کس طرح فکر معاش میں شب و روز سرگرداں اور جبر واستحصال کے پنجے میں جکڑے مزدور اور کسان کو آزادی کا خواب دکھایا گیا۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے اس نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے فیصلے کر ڈالے۔ اپنا دین دھرم تک تیاگ دیا۔ اس خواب سے بیداری ہوئی تو معلوم ہوا کہ خواب چُرا لیے گئے ہیں تعبیر چھین لی گئی ہے۔ اس سراب کی حقیقت سے آگاہی ہوئی تو پتہ چلا کہ استحصالی نظام میں اُن کے آقا بدل گے ہیں ، نظام نہیں بدلا ۔ ''سرخ سویرے'' کے طلوع ہونے کا نظریہ باطل ہو گیا۔ ناول نگار نے ناول میں معاشرے کے دیگر چیدہ چیدہ موضوعات کو بھی برتا ہے۔ مُلک کی سیاسی صورتِ حال اور ابن الوقتوں کی چال بازیاں ، کٹھ ملاؤں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی منافقانہ زندگی حتیٰ کہ معاصر سیاسی حالات کی عکاسی بھی کر گئے ہیں۔ ناول کی کہانی میں مصنف کے لہجے کی کاٹ اور طنز نمایاں ہے۔

ڈکشن اور علامتوں کے بار بار دہرائے جانے کے باوجود ناول کا فکری اور نظریاتی پہلو بڑا جاندار ہے۔ مصنف نے بین السطور بہت سے ایسے سوالات اٹھائے ہیں جو ہنوز جواب طلب ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تارڑ نے اس ناول میں ایک دنیا کو پاگل کر دینے والے نام نہاد سرخ سویرے کے ڈھول کا پول نہایت سلیقے سے کھولا ہے۔ مارکس اور لینن کو آخری رہبر و رہنما مان کر قومی تہذیب اور آبائی مذہب سے بدظن اور باغی ہو جانے والے لوگوں کے شکستہ ارمانوں کی نہایت دل دوز تصویرکشی کی ہے۔ ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول نگار نے ن۔م راشد کی نظم کی معنویت اور معنی خیزی سے ایک مُنہدم ہوتے نظام کا تانا بانا بڑی خوب صورتی سے بُنا ہے۔ تارڑ کے تازہ ترین ناول کا نام منطق الطیر جدید ہے جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کے انتساب میں متن اور موضوع کی تلخیص موجود ہے۔ انتساب ہے ''پرندوں کی بولیاں میرے کانوں میں پھونکنے والے مرشد عطار کے نام''

جدید پاکستانی افسانہ نگاروں میں محمد حمید شاہد کا نام سرِ فہرست ہے۔ مٹی آدم کھاتی ہے اُن کا پہلا

ناول ہے جو جدید تکنیک میں لکھا گیا ہے ۔ یہ ایک مختصر مگر معنویت سے بھر پور علامتی ناول ہے ۔ ناول کا انتساب ہے ۔''آدمی کے نام جو زمین کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے ۔'' یہ انتساب ہی ناول کا مرکزی خیال (Theme) ہے ۔ کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے دوراوی ہیں۔ یہ دوراوی ہی اس ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ ناول کی کہانی کا مسودہ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے ملبے سے ملا تھا۔ مسودے میں ابھی کچھ اور لکھا جانا تھا کہ زلزلہ آ گیا۔ ناول کا اختتام مٹی ہی کی استعاراتی معنویت پر ہے ۔ یعنی مٹی تو مٹی ہے ۔ اس مختصر سے ناول کی کہانی اور اس کی جُزئیات مٹی کی معنویت کو ظاہر کرنے کے لیے ضروری تھی جس پر ناول کی عمارت کھڑی ہے ۔ بہ قول ڈاکٹر ممتاز احمد خان ناول کی مجموعی خوبی یہ ہے کہ یہ ''مٹی'' کی تفہیم کرا دیتا ہے اسے پڑھ کر ایک سوال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ ربِ کائنات نے انسان کو مٹی سے کیوں تخلیق کیا اور مٹی ہی کے سُپرد کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ اس امر کو سمجھنے سے ناول کے ماجرے کی گرہیں کھلتی چلی جائیں گی ۔ یہ ناول ہمیں دعوت فکر دیتا ہے کہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی عروج اور زوال میں مٹی کا کیا کردار ہے ۔ یہ ایک اہم سوال ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ مجموعی طور پر ناول ایک ابدی صداقت کا اظہار ہے یعنی مٹی کی محبت میں انسان دیوانہ ہو جاتا ہے ۔ ناول مباحث انگیز ہے ۔ یقیناً اس کے متن اور تکنیک پر ادبی بحثیں جاری رہیں گے اور اس کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے ۔

افسانہ نگار اور ناول نگار حسن منظر کے تمام ناولوں میں العاصفہ اور دھنی بخش کے بیٹے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ۔ اب ان سطور میں اہم ان دونوں ناولوں کا مختصر تعارف اور تجزیہ پیش کر رہے ہیں ۔ العاصفہ حسن منظر کا ایک ایسا جدید اور غیر معمولی ناول ہے ۔ جس میں مکمل پلاٹ ،عُمدہ کردار نگاری دلچسپ اور فطری مکالمے ، دل کو چُھو لینے والی حقیقت نگاری اور دلکش انداز بیاں کی خوبیاں موجود ہیں ۔ یہ ناول بنتے بگڑتے اور تبدیل ہوتے ہوئے انسانی رشتوں کی کہا نی ہے ۔ العاصفہ کی پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ Highly Readable ہے اور یہ اُن ناولوں میں سے ہے جن کو شروع کر کے پڑھا نہیں جاتا بلکہ یہ اپنے آپ کو پڑھوا لیتے ہیں ۔ یہ ناول آج کی Complex زندگی کی عکاسی کرتا ہے جس میں اقدار بدل رہی ہیں اور انسان بھی ۔ جس میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔''العاصفہ'' باپ بیٹے کے درمیان مسلسل Conflict کی کہانی ہے ۔ دونوں کے درمیان بے اعتمادی کا عجیب رشتہ ہے ۔ دونوں نہ تو ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور نہ ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہتے ہیں۔ زید کے دل میں باپ کے خلاف نفرت ہے اور وہ اس نفرت کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ بچپن میں ہی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر باپ کا نام لکھ کر اسے دفن کر دیتا ہے ۔ باپ سے بیٹے کی نفرت کا ایک بڑا سبب ماں باپ کی بے جوڑ شادی ہے ۔ ماں خوب صورت اور باپ بدصورت ہے ۔ بہ ہر حال زید کے لیے باپ کے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے اور اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا بھی مشکل ۔ اس لیے وہ Hamlet کی طرح To be or not to be کے عذاب سے گزرتا رہتا ہے ۔ یہ رشتے اور بندھن انسان کو اس طرح جکڑ لیتے ہیں کہ بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی Compromise کرنا ہی پڑتا ہے ۔

العاصفہ زید اور مُنیرہ کی معصوم محبت کی کہانی ہے ۔ ایسی محبت جسے الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں

ہوتی۔۔جس میں خموشی گفتگو اور بے زبانی زبان بن جاتی ہے۔ العاصفہ ایک تہہ در تہہ ناول ہے۔ پردے اٹھاتے جائیں اور نئے نئے مناظر دیکھتے جائیں۔ تاہم یہ بنیادی طور پر انسانی رشتوں کی کہانی ہے گھر والوں سے رشتے، شہر والوں سے اور دنیا والوں سے رشتے۔ یہ ناول لوکل بھی ہے نیشنل بھی اور انٹرنیشنل بھی۔ اس میں مقامی رنگ بھی ہے اور بین الاقوامی بھی۔ یہ ناول اس دور میں Rootlessness کی کہانی بھی ہے۔ ناول میں خود سوانحی رنگ کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ناول کے اسلوبِ تحریر کی خوبی سادگی اور سلاست ہے۔ ناول نگار کے Powerful Style کی وجہ سے ناول کے کردار اور واقعات نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں اور ہم ان کی موجودگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ حسن منظر سادگی اور پُرکاری سے بات کہنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ العاصفہ کا انجام المیہ ہے۔ یہ المیہ انجام ہی اس ناول کو منفرد بناتا ہے۔ العاصفہ جدید پاکستانی ناول کی تاریخ میں جگہ بنا چکا ہے کیونکہ اس میں جدید دور کے مسایل کا ذکر ہے۔ آنے والے دونوں میں ادبی حلقوں میں اس ناول کا ذکر ہوتا رہے گا۔ حسن منظر کے دوسرے قابلِ ذکر ناول کا نام دھنی بخش کے بیٹے ہیں۔ اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے حالیہ برسوں میں شائع ہونے والے ناولوں میں ایک اہم ناول ہے۔ سندھ کے ایک دُور افتادہ گاؤں ''دھنی بخش'' میں ایک خاندان آباد ہے۔ گاؤں کا یہ نام بھی ناول کے مرکزی کردار کے والد کے نام پر ہے جو اس گاؤں کا مالک بھی ہے۔ ناول کی پوری کہانی اس خاندان کے گرد گھومتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کا صدیوں سے بنایا ہوا استحصالی نظام اور اس کے شکنجے میں جکڑے ہوئے غریب عوام اس ناول کا بنیادی موضوع ہیں۔ حسن منظر کا کمال یہ ہے کہ ہمیں فکشن کے پیرائے میں یہ بھی باور کرا دیتے ہیں کہ جبر و استحصال کا شکار یہ طبقہ اپنی حالت خود بھی نہیں بدلنا چاہتا۔ وہ اس ظلم اور زیادتی پر نہ جانے کیوں صابر اور شاکر ہو گیا ہے۔ یہی وہ چُبھتا ہوا سوال ہے جو ناول نگار نے اٹھایا لیکن کہیں بھی مصلح اور واعظ کا رُوپ نہیں دھارا بلکہ سرسری انداز میں ان باتوں کا ذکر کر کے آگے بڑھ جاتا اور قاری کے لیے کئی سوالات چھوڑ جاتا ہے۔

ناول میں سب سے اہم کردار احمد بخش ہے۔ کہانی کو بیان کرنے والا ہمہ دان راوی جب بھی براہِ راست بات کرنا چاہتا ہے تو وہ بالعموم اسی کردار کا سہارا لیتا ہے۔ کہانی کا غالب حصہ اسی کے زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ ناول کا دوسرا اہم کردار علی بخش ہے۔ ناول نگار نے دنیا بھر کی خامیاں اور برائیاں اس کی ذات میں جمع کر دی ہیں۔ اپنے طرزِ عمل میں یہ کردار ناول کا سب سے فعال کردار ہے۔ تاہم اس کی تمام تر فعالیت جنس اور شراب کے گرد گھومتی ہے۔ اس ناول کی کہانی بتاتی ہے کہ جن پر ظُلم ہوتا ہے وہ اسے ظُلم نہیں سمجھتے بلکہ ظالم کا اپنی شخصیت پر حق سمجھتے ہیں۔ اس احساس کو صرف تعلیم ہی ختم کر سکتی ہے۔

نکہت حسن کا ناول جاگنگ پارک عبداللہ بیگ کا ناول راجپوت یونس جاوید کا کنجری کا پُل محمد الیاس کے ناول برف، کُہر، دُھند اور بارش خاتون افسانہ نگار اور ناول نگار طاہرہ اقبال کا ناول مٹی کی سانجھ اور نیلی بار، علی اکبر ناطق کا نولکھی کوٹھی اختر رضا سلیمی کا جاگے ہیں خواب میں اور جندر (ناولٹ) محمد حامد سراج کا ناولٹ آشوب گاہ نیلم احمد بشیر کا 11 / 9 کے پس منظر میں لکھا ناولٹ طاؤس فقط رنگ پاکستانی ناول کی تخلیقی جہات میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ حرف آخر یہ کہ ناول کی تخلیق بڑی ذمہ

داری کا کام ہے۔ بلکہ یہ بات ذمہ داری سے بڑھ کر ضبط، سلیقے، باریک بینی، ریاضت اور مسلسل تخلیقی کرب تک جا پہنچی ہے۔ ناول کی صنف پورے فنکار کی متقاضی ہوتی ہے۔ ادب کی دیگر اصناف میں جُز وقتی مہارت سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن ناول کو پوری توجہ، پورا وقت اور پورا آدمی درکار ہوتا ہے۔ گزشتہ سطور میں جن ناول نگاروں کے فن کا ذکر آیا وہ یقیناً ان اوصاف سے مکمل طور پر متصف ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر پیش لفظ، نئی صدی نئے ناول (غفور احمد) لاہور: کتاب سرائے اردو بازار، ۲۰۱۴ء، ص۵

۲۔ سراج منیر، کہانی کے رنگ، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۶ء ص۱۷

۳۔ انور سجاد، ڈاکٹر، ڈان۔ Books and Authors۔ ۱۰ مارچ ۲۰۱۰

۴۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۵

۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، سہ ماہی آئندہ (پاکستانی ادب نمبر) کراچی: جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء ص ۲۷

۶۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء ص۵۹

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، بانو قدسیہ شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۵

۸۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر آزادی کے بعد اردو ناول، ہیئت، اسالیب اور رجحانات، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۸ء، ص۱۲۸